

اسلامی ریاست عصر حاضر میں

(۲)

محمد و احمد غازی

اسلامی نظام حکومت و سیاست پر اس عمومی گفتگو کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند ایسے علمی مسائل کی طرف بھی ضروری اشارے کر دیئے جائیں جو آج کل عموماً موضوع بحث بنتے رہتے ہیں اور عام طور پر ان امور کے بارے میں علمی اور دینی حلقوں میں خاصی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ امور درج ذیل ہیں۔

- ۱۔ اسلامی حکومت (امامت) کس طرح قائم ہوتی ہے۔
 - ۲۔ کیا اسلامی ریاست میں پارلیمنٹ قائم ہو سکتی ہے۔
 - ۳۔ شوریٰ اور قانون سازی کے حدود کار کیا ہیں
 - ۴۔ کیا اسلامی سیاست میں سیاسی پارٹیاں وجود پذیر ہو سکتی ہیں
 - ۵۔ کیا انتخابات میں ہر بالغ کو رائے دینے کا حق حاصل ہے۔
 - ۶۔ کیا اپنے آپ کو بطور امیدوار پیش کرنے کی اجازت ہے۔
- ۱۔ اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے۔

متعلقہ آیات قرآنی اور احادیث کے گہرے مطالعے سے یہ بات قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ اپنے حکمرانوں کے تقرر کا حق صرف امت مسلمہ کو حاصل ہے۔ امت کے رہنما صرف وہ لوگ ہونے چاہئیں جنہیں

امت کا اعتماد حاصل ہوا اور امت ان پر مجبور نہ کرتی ہو۔ یہ وہ بنیادی اصول ہے جس پر زیر نگین کو موضوع سے دلچسپی رکھنے والے تمام مسلم فقہاء اور مفکرین نے بحث کی ہے چند متعلقہ احادیث میں اس نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ لعن اللہ امام قوم و ہم لہ کارہون

اللہ تعالیٰ کسی قوم کے اس رہنما پر لعنت بھیجتا ہے جسے لوگ ناپسند کرتے ہوں۔

۲۔ خیارکم الذین تحبونہم وحبوکم و یصلون علیکم و یصلون علیہم و نشرکم

الذین تبغضونہم و یبغضونکم و یلعنونہم و یلعنوکم۔

تمہارے بہترین رہنما وہ لوگ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں اور وہ تم پر درود و سلام بھیجیں اور تم ان پر درود و سلام بھیجو اور تمہارے بدترین رہنما وہ لوگ ہیں جن سے تم نفرت کرو اور وہ تم سے نفرت کریں اور جن پر تم لعنت بھیجو اور وہ تم پر لعنت بھیجیں (صحیح مسلم بروایت عرفدین مالک) اس باہمی اعتماد و محبت اور مجبور سے کی اہمیت پر قدیم مسلم مفکرین نے بھی روشنی ڈالی ہے۔

ہم ان میں سے کچھ کے خیالات یہاں پر نقل کرتے ہیں۔ علامہ سعد الدین تغتازانی (متوفی ۷۳۹ھ/

۵۱۳۸۹ فرماتے ہیں۔

ومن صفاتہم الضروریۃ ان یکونوا بحیث یتبعہم سائر الناس۔

ان (رہنماؤں) کی ضروری صفات میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی حیثیت ایسی ہوتی چاہیے کہ تمام لوگ

ان کی پیروی کریں۔

شاہ ولی اللہ (متوفی ۱۱۶۶ھ/۱۷۶۲ء) کہتے ہیں؟

المسلم فی الخلافۃ رضا الناس بہ واجتہاد علیہم علیہم و توقینہم ایاہ وان یتقیم

الحدود و ینازل دون المسلمۃ و ینفذ الاحکام

خلافت کے سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ لوگ خلیفہ سے خوش ہوں اس کے گرد جمع ہوں اس کی عزت کریں اور یہ کہ وہ حدود جاری کرے۔ ملت کا دفاع کرے اور احکام نافذ کرے: (۱۲)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس باہمی اعتماد اور مصروفے کا اظہار اور تحقق کیسے ہو خلیفائے راشدین کے انتخاب میں مختلف طریقے اختیار کئے گئے، ہمارے مؤرخین نے تفصیل سے ان سب واقعات کا ذکر کیا ہے۔ بالخصوص علامہ ابن جریر طبری اور حافظ ابن کثیر نے اپنی ماہیہ ناز کتاب البدایہ والنہایہ میں بہت سی تفصیلات بیان کی ہیں۔ یہاں ان سب تفصیلات کو دہرانے کا تو موقع نہیں لیکن اتنی بات تو واضح ہے وہیسا کہ انتخاب حضرت عثمان کے ضمن میں علامہ ابن کثیر نے تصریح کی ہے، کہ متعلقہ اشخاص کے بارے میں کسی نہ کسی طرح امت کے اعتماد کا تحقق بہر حال ہوا۔

اس اہم مسئلے کے بارے میں قرآن و سنت کی خاموشی اور خلیفائے راشدین کے انتخاب میں مختلف طریقے اختیار کئے جانے کا واضح مطلب یہ ہے کہ یہ مسئلہ بھی ان مسائل سے تعلق رکھتا ہے جن کے بارے میں امت کو پورا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ انسانی عقل اور تجربے کی روشنی میں عرف اور معطلت کے مطابق نیز شریعت کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے جو طریقے کار مناسب سمجھے اختیار کر لے۔

یہاں یہ امر واضح کر دینا ضروری ہے کہ عرف، معطلت اور لوگوں کا عام پسندیدہ طرز عمل اسلامی قانون کے ایسے ہی صحیح اور جائز ماخذ ہیں جیسے دوسرے ثانوی ماخذ مثلاً قیاس، استحسان یا استدلال وغیرہ۔ مسلمان فقہاء نے ان ماخذ پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے اور نفس یا اجماع کی عدم موجودگی میں ان کے جواز کو ثابت کیا ہے۔ عرف کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔ عادتہ جمہور قوم فی قول اولیٰ۔ کسی قوم کا عام طرز عمل قول میں یا عمل میں۔

مسلم فقہانے بھی بہت سے قانونی اصولوں کی بنیاد عرف پر رکھی ہے ان میں سے چند اصولوں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

الثابت بالعرف كالثابت بالنص

۱۔ ”جو چیز عرف سے ثابت ہو وہ ایسی ہی ہے جیسی نص سے ثابت شدہ چیز“

استعمال الناس حجة يجب العمل بها۔

۲۔ ”لوگوں کا عام طرز عمل حجت ہے اور اس پر عمل کرنا واجب ہے“

التعيين بالعرف كالتعيين بالنص۔

۳۔ کسی امر کا عرف کی بنیاد پر متعین کیا جانا ایسا ہی ہے جیسے نص کی بنیاد پر متعین کیا جانا۔^(۴) یہی

اہمیت معلومت کی ہے۔ اسے بھی اسلامی قانون کے ثانوی ماخذ میں سے ایک قرار دیا گیا ہے اس کی تعریف بطریق ذیل کی گئی ہے۔

”اس سے مراد ہر قسم کی بھلائی اور عام بہبود کا عمل ہے جس کے متعلق شریعت میں صراحت یا اشارہ یا دلالت کوئی نص وارد نہ ہوئی ہو۔“

ہر وہ چیز جو شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی کے بغیر انسانی زندگی کی پانچ بنیادی ضرورتوں کا تحفظ

کے مصطلحت ہے۔ وہ پانچ بنیادی ضروریات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱) مذہب (۲) روح (۳) عقل و ذہن (۴) اولاد (۵) مال و دولت اور جائیداد

شریعت میں اولی الامر کو وسیع اختیارات دیئے گئے ہیں تاکہ وہ ان پانچ بنیادی ضرورتوں کے تحفظ

کے لئے ضروری اقدامات کر سکیں اور مناسب قوانین اور قواعد وضع فرماتا کر سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت

کے فیصلوں کی اکثریت اسی طرح معاملات سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ قواعد و ضوابط جو ملک کے عمومی نظم و نسق

کی بہتری کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ سڑکوں، عمارتوں، بندوں اور پولوں کی تعمیر و ترقی کے اصولوں کی تیاری

اور اس طرح کی تمام چیزیں مصالحہ مسئلہ کے دائرے سے تعلق رکھتی ہیں۔

قومی مفاد سے تعلق رکھنے والے معاملات کے بارے میں لوگوں کی عمومی پسند و ناپسند کے اظہار کے لئے کسی قابل

عمل اور مناسب نظام کی نشوونما بھی عرف اور مصلحت ہی کے سلسلے سے تعلق رکھتی ہے جس طرح حکومت وقت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ معاہدہ کی دیگر تمام اشکال پیمائگی سے اور منصفانہ طور پر عمل درآمد کے لئے شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے قواعد و ضوابط تیار کرے۔ اسی طرح اسے یہ حق بھی حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اس معاہدے کے لئے بھی نقص سے پاک طریقے دریافت کرے۔ تاہم یہ سب کچھ امت کے نائنڈوں کے مشورے سے اور اس سلسلے میں شریعت کے جو بنیادی اصول ہیں ان کا لحاظ رکھتے ہوئے کیا جانا چاہیے^(۵)۔

اس امر کے ثابت ہو جانے کے بعد کہ عوام کی پسند اور اعتماد کے تحقق کا مسئلہ خود امت پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس کے لئے جو چاہے طریقہ اپنائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے قدیم فقہ اور سیاسی مفکرین کے خیالات و آراء کی روشنی میں اس تعلق کی بھی وضاحت کریں جو اولی الامر و امت مسئلہ کے درمیان پایا جاتا ہے۔

امت اور امام کے درمیان جو تعلق ہے اس کی نوعیت ایک معاہدے کی ہے۔

چھٹی صدی ہجری کے مشہور حنفی فقیہ ملک العلماء علامہ علاؤ الدین ابو بکر کاسانی نے اس کو وکالت (AGENCY) کے معاہدے سے مماثلت دی ہے۔ امت موکل (PRINCIPAL) ہے اور امام وکیل (AGENT) ہے موکل کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے وکالت (ایجنسی) کا معاہدہ منسوخ کر دے۔ اس طرح امت جب چاہے وکالت (ایجنسی) کے معاہدے کو منسوخ اور اولی الامر کو برفٹ کر سکتی ہے۔ امام اور حکومت کے دوسرے کارکن صرف اس وقت تک اپنے عہدوں پر بقرار رہیں گے جب تک امت ان سے خوش اور مطمئن رہے۔ اس معاہدے کے قانونی مضمرات اور اس کی نوعیت پر بحث کرتے ہوئے علامہ کاسانی لکھتے ہیں۔

”جو چیز وکیل کو وکالت سے ہٹا دیتی ہے وہی چیز قاضی کو اس کے عہد سے سے بھٹا کر دیتی ہے ان

دونوں میں کوئی فرق نہیں سوائے ایک چیز کے اور وہ یہ کہ جب موکل (PRINCIPAL) مرجاتا ہے یا موکل کی حیثیت سے، برطرف ہو جاتا ہے تو وکیل (AGENT) بھی خود بخود اپنی یہ حیثیت کھو بیٹھتا ہے لیکن خلیفہ کی موت یا اس کے برطرف ہوجانے کی صورت میں حج اور دوسرے سرکاری احکام اپنے عہدوں سے معزول نہیں ہوتے اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ وکیل (AGENT) اپنے موکل کے اختیار کے تحت اس کے ذاتی حق کو استعمال کرتے ہوئے کام کرتا ہے اور اس (موکل) کی موت کی برطرفی اس کی قانونی اہلیت کو ختم کر دیتی ہے۔ چنانچہ نتیجے کے طور پر اس کا مقرر کیا ہوا وکیل وکالت کے منصب پر باقی نہیں رہتا لیکن اس کے برعکس قاضی خلیفہ کے اختیار کے تحت اور اس کا ذاتی حق استعمال کرتے ہوئے کام نہیں کرتا بلکہ مسلمانوں کے اختیار کے تحت اور ان کے حقوق استعمال کرتے ہوئے کام کرتا ہے۔ خلیفہ (قاضی کا تقرر کرتے وقت) مسلمانوں کا صرف پیغامبر یا کارندہ ہوتا ہے۔ چونکہ وہ ان کا پیغامبر ہوتا ہے اس لئے اس سے صادر ہونے والے تمام افعال و حقیقت مسلمان عوام کے افعال ہوتے ہیں جن کا اختیار خلیفہ کے افعال کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی اس اختیار کا استعمال جاری رکھتا ہے۔^(۶)

ایک قدیم ترفیہ قاضی ابو بکر الباقلائی (متوفی ۴۳۳ھ) نے اس نکتے کی وضاحت بہتر انداز

میں کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

”امام جن اختیارات کا استعمال کرتا ہے وہ ان تمام کا استعمال امت کے کارندے اور نائندے کی حیثیت سے کرتا ہے۔ امت ہمیشہ امام کے پیچھے رہتی ہے تاکہ اس کی اصلاح کرتی رہے۔ اسے صلوات ستیم پر قائم رکھے، اسے یاد دہانی کرتی رہے۔ اسے تنبیہ اور نصیحت کرتی رہے۔ اور جب کوئی حق اس پر واجب ہو اس سے وصول کر لے اور جب وہ کسی ایسے فعل کا ارتکاب کرے جس کے باعث اس کی برطرفی ضروری ہو اسے معزول کر کے کسی دوسرے شخص کو اس کی جگہ امام مقرر کر دے۔“^(۷)

دوسرے مفکرین جیسے سعد الدین تفتازانی، عبدالدرین ابجدی اور امام رازی بھی ایسی ہی رائے رکھتے ہیں وہ امت ہی کو اختیار حکمرانی کا حامل تصور کرتے ہیں^(۸)۔

چونکہ امامت دو فریقوں یعنی امت اور امام کے مابین ایک معاہدہ ہے اس لئے لازمی طور پر اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ معاہدہ باہمی رضامندی سے ہونا چاہئے اور اس پر عمل درآمد ان شرائط کے مطابق ہونا چاہئے جو قانون معاہدات میں درج ہیں۔ اس میں ایک پہلو گوواہی پایا جاتا ہے۔ معاہدہ کرنے والے دو فریقوں میں سے ایک یعنی امت کے ارکان اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ دوسرا فریق اس کا مستحق ہے کہ اسے کا زبردہ مقرر کیا جائے۔ لہذا فقہاء کی ایک بڑی تعداد نے دہندگان کے لئے یہ شرط عائد کی ہے کہ وہ ان شرائط کو پورا کرتے ہوں جو گواہ کے لئے ضروری ہیں۔ پاکستان کے مفتی محمد شفیع اور عراق کے شیخ قطان عبدالرحمان الدوری بھی ہی رائے رکھتے ہیں^(۹)۔

مسلم فقہانے امام کی شرائط و صفات اور قابلیت و نیاقت پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان چیزوں کو یہاں دھراناطالت کا موجب ہو گا۔ تاہم اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ امام کو اپنی نیکی، تقویٰ، سیاست دانی اور سیاسی قابلیت کے لحاظ سے امت میں ممتاز ہونا چاہئے۔ یہ آخری پہلو نیکی اور تقویٰ سے بھی زیادہ اہم ہے۔

امام احمد بن حنبلہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ اگر کسی امیر کے انتخاب کا مسئلہ ہمارے سامنے ہوا تو ہمیں دو اشخاص میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو جن میں سے ایک نیک لیکن نا تجربہ کار اور دوسرا نیکی میں نسبتاً کم لیکن سیاسی اور حکومتی امور میں زیادہ تجربہ رکھتا ہو تو ترجیح اس شخص کو دی جانی چاہئے چونکہ یہی خواہ نسبتاً کم ہو لیکن تجربے میں زیادہ ہو۔ یہی رائے امام ابن تیمیہ کی ہے^(۱۰)۔

اس نقطہ نظر کی تائید حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے طرز عمل سے بھی ہوتی ہے۔ صحابہؓ میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو اپنی نیکی و عبادت گزار ہی اور زہد

جائزگی کے باعث اپنے ساتھیوں میں ممتاز تھے لیکن نہ تو وہ نظم و نسق اور حکومتی معاملات چلانے کا طبعی رجحان رکھتے تھے نہ تجربہ۔ لہذا نہ تو انہیں کوئی عہدہ دیا گیا نہ کوئی اور سرکاری ذمہ داری۔ ان لوگوں میں حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جیسے بزرگ صحابہ شامل ہیں۔ اس کے برخلاف حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سرکاری عہدے ایسے لوگوں کو دیئے جو یقیناً نیکی دینی علم اور اللہ سے ڈرنے میں حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن مسعود کے ہم پلہ نہیں تھے۔

۲۔ کیا اسلامی ریاست میں پارلیمنٹ بن سکتی ہے۔

پارلیمنٹ کو اپنے موجودہ مفہوم کے لحاظ سے بہت سے فرائض انجام دیتے پڑتے ہیں اور یہ فرائض ہر ملک میں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ انہیں مندرجہ ذیل چھ اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ قانون سازی سے متعلق فرائض

۲۔ انتخابی فرائض

۳۔ مالی فرائض

۴۔ انتخابی فرائض

۵۔ عدالتی فرائض

۶۔ غور و فکر یا بحث مباحثہ سے متعلق فرائض

ان میں سے کچھ فرائض تو ان فرائض سے ملتے ہیں جو ہماری گزشتہ تاریخ میں اہل حل و عقد بحال لاتے رہے ہیں جب کہ کچھ دوسرے ایسے ہیں جو شوریٰ کے دائرے میں آتے ہیں جہاں تک پارلیمنٹ کے عدالتی فرائض کا تعلق ہے (جیسا کہ برطانوی دارالاملا) تو جو تاریخی شہادت ہم تک پہنچی ہے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اہل حل و عقد یا شوریٰ نے یہ فرائض کبھی انجام نہیں دیئے یہ فرائض عدالتیں ادا

کئی تھیں یا سربراہ مملکت اپنے اپیلوں کے اختیار سماعت کو بروئے کار لاتے ہوئے خود انجام دیتا تھا۔ جہاں تک پاکستان میں پارلیمنٹ کے قانون سازی سے متعلق قرآن کا تعلق ہے سب لوگ اس پر متفق ہیں کہ ہماری پارلیمنٹ کو بنیادی طور پر برطانوی پارلیمنٹ سے جیسے پارلیمانی اداروں کی ماں (MOTHER PARLIAMENT) کہا جاتا ہے اور جو بقول مغربی قانون دانوں کے کسی مرد کو عورت اور عورت کو مرد بنا دینے کے سوا سب کچھ کرنے کا قانونی اختیار رکھتی ہے مختلف ہونا چاہیے۔ ہماری پارلیمنٹ اپنے آپ کو اس امر کا پابند نہ چیکے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے اصول کو بحال رکھے گی۔ وہ تسلیم کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کے عوام کو مقدس امانت کے طور پر جو اختیار تفویض کیا ہے اسے انہی حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کیا جانا چاہئے جو اس حاکم مطلق اور فرمانروا نے تحقیق نے قرآن مجید اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں متعین کر دی ہیں^(۱۱)۔ ہماری پارلیمنٹ پابند ہے کہ وہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کرے جو قرآن و سنت کے منافی ہو۔ اگر پارلیمنٹ کوئی ایسا قانون نافذ کرے جو قرآن و سنت کے منافی ہو تو ہمارے موجودہ دستور کی دفعہ ۲۰۳ اور اس کے بعد کی دفعات سے اس کا مناسب سدباب ہو سکتا ہے۔ مزید برآں گذشتہ صفحات میں ہم نے اس امر پر بحث کی تھی کہ ایسے معاملات میں جہاں قرآن و سنت نے کوئی حکم نہ دیا ہو امانت کو فیصلے کرنے کی وسیع آزادی حاصل ہے۔ اس بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ امت کے بااعتماد نمائندوں کے لئے وسیع میدان موجود ہے کہ وہ قیاس، استحسان، استسلاح وغیرہ کے طریقوں سے کام لیتے ہوئے قواعد وضوابط تیار کریں۔ جب تک ہمارے ملک میں پارلیمنٹ کے پاس کئے ہوئے قوانین کا عدالتی جائزہ لینا اور قرآن و سنت سے متصادم قوانین کو حدود آئین سے متجاوز (ULTRA VIRES) قرار دینے کے لئے عدالتیں موجود ہیں اس وقت تک اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ پارلیمنٹ کو ایسے انضباطی معاملات میں قانون سازی کے ضروری اختیارات

دے دیئے جائیں جو نفع یا اجماع کے دائرے میں نہ آتے ہوں اور جن میں پارلیمنٹ REGULATORY قانون وضع کر سکے۔

صرف یہ حقیقت کہ لفظ پارلیمنٹ یا اس کا موجودہ تصور کا ماخذ مغربی تاریخ ہے اسلامی نقطہ نظر سے اس امر کے لئے کافی وجہ جواز نہیں کہتی کہ اس صدیوں پہلے ادارے کو خام نگرہی اور جلد بازی سے فیصلے کے نتیجے کے طور پر ختم کر دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور خلفائے راشدین کی تاریخ سے ایسی بہت سی مثالیں اور نظریں مل جائیں گی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری قوموں کے لئے بہت سے ادارے اور طریقے اختیار کئے۔ اگر یہ دیکھا گیا کہ یہ ادارے اور طریقے اسلام کے خلاف نہیں تو انہیں جوں کا توں اختیار کر لیا گیا۔ کبھی ایسا ہوا کہ ان میں امرت کی ضرورت کے مطابق ردوبدل کر لیا گیا اور ان میں اسلامی روح چھونک دی گئی۔ اس سلسلے میں جنگی چسائیں اور محامل کی وصولی بطور مثال پیش کی جا سکتی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فارسی کے بطور سرکاری زبان استعمال کئے جانے پر کوئی اعتراض نہ کیا اور اس کی یہ حیثیت آئندہ تقریباً پچھتر سال تک باقی رہی یہاں تک کہ حجاج بن یوسف نے اس کے بجائے عربی کو رواج دیا۔

نور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مقامی رواجوں اور اداروں کو جو ان دنوں عرب میں موجود تھے۔ ضروری تبدیلیوں کے ساتھ اختیار کیا اور انہیں بجا طور پر اسلامی قانون میں صحیح مقام ملا۔ تاہم انہیں پودے سے طور پر اسلامی ڈھانچے میں ڈھال لیا گیا۔ ہم پہلے بھی پارلیمنٹ کی نوعیت اور ذرائع میں تبدیلیاں پیدا کر چکے ہیں۔ اگر اسلامی نقطہ نظر سے مزید تبدیلیوں کی ضرورت محسوس ہو تو ابھی شروع سے اس میں مزید اہم ترامیم کی جا سکتی ہیں۔ ہمیں دوسری اقوام کے علم اور تجربے سے استفادہ کرنے میں ہرگز جھجک محسوس نہ کرنی چاہیے۔ اگر کسی قوم نے کسی ایسی جھلانی کے حصول کا نیا اور بہتر طریقہ دریافت کر لیا ہے جس کا اسلام بھی حوامی ہے تو ہمیں ضروری تبدیلیوں کے بعد اسے اپنانے

میں شامل نہیں کرنا چاہیے۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا جو عموماً نقل کی جاتی ہے اور جس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ الحکمۃ ضالۃ اللومن انی وجدھا فہلوا حقن دہما۔ حکمت مومن کی کھوئی ہوئی دولت ہے جہاں کہیں اور جب کبھی اسے ملے وہ اس حکمت (۱۲) کا زیادہ حقدار ہے۔“

موجودہ پارلیمنٹ کے کچھ فرانس اسلامی دور میں اہل حل و عقد بنالائے تھے۔ وہ انتظامی اور انتخابی فرانس انجام دیتے تھے۔ ملکی معاملات میں شہرہ اور تبادلہ خیال سے متعلقہ فرانس شوریٰ کے ذمے تھے۔ رہی قانون سازی تو وہ غالباً غیر سرکاری سطح پر فقہائے امت اور قضاة عدالت انجام دیتے تھے۔ یہ دو ادارے یعنی شوریٰ اور اہل حل و عقد بیشتر صورتوں میں دو ممتاز الگ الگ ادارے تھے۔ اہل حل و عقد کے مقابلے میں شوریٰ ایک چھٹی تنظیم تھی۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دور میں ان صحابہ کو خصوصی امتیاز حاصل تھا جنہوں نے غزوہ بدر میں شرکت کی تھی اور یہی وہ لوگ تھے جن پر اہل حل و عقد کی اکثریت مشتمل تھی جب عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مطلوبانہ شہادت کے بعد لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ وہ خلافت کا منصب سنبھالیں تو انہوں نے اس وقت کے مروجہ طریقہ کار کے بارے میں قانونی نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

یہ آپ کا کام نہیں ہے اہل بدر کا ہے۔ جس سے اہل بدر راضی ہوں گے وہی خلیفہ بنے گا۔ آنجناب کے اس قول پر تصریح کرتے ہوئے دو جلیل القدر شافعی فقہاء علامہ خطیب شہربندی (متوفی ۷۹۷ھ) اور علامہ شہاب الدین بریلی (متوفی ۱۰۰۴ھ) کہتے ہیں۔

”اس لئے کہ معاملات کا انتظام والنظام ان (اہل بدر) کے ہاتھ میں ہے اور تمام لوگ انہی کی پیروی کرتے ہیں۔“ (۱۳)

اگرچہ اہل حل و عقد انتخابی ادارے کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے ہیں لیکن اس امر کو کبھی فروری اور لازمی نہیں سمجھا گیا کہ رائے دہندگان کا حق صرف انہی تک محدود کر دیا جائے۔

اسے سلسلے میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اجتہادِ مصلحت وقت اور عرف میں بھی تبدیلی آتی رہی ہے کیونکہ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہر وہ قانون جس کی اساس مصلحت وقت عرف یا ایسے ہی ثانوی ماخذ پر ہو وہ زمان و مکان کے تقاضوں کے مطابق تبدیل کیا جاسکتا ہے اور اس میں مناسب ترمیم بھی کی جاسکتی ہے اس معاملے میں شہرتا زنی اصول ہے۔

لا یشکر تغیر الاحکام بتغیر الازمان۔

”اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وقت کے بدل جانے سے احکام (جن کی بنیاد ثانوی ماخذ پر ہو) بدل جاتے ہیں۔“

زمان و مکان کی روح سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے جب کبھی تبدیلی کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اہل صل و عقد سے متعلق طرز عمل میں بھی تبدیلی آئی۔ تاہم وہ اصل اصول جو اس میں کارفرما تھا جو کاتوں رہا۔ یعنی عوام کا اعتماد اور رضامندی مثال کے طور پر امام غزالی فرماتے ہیں۔

فان شروط ابتداء الاعتقاد قیام الشوكة۔ ولا تقوم الشوكة الا بموافقة الاكثرین من معتبری کل زمان۔

”معاہدہ (امامت) کے ابتداء وجود میں آنے کے لئے لازمی شرط ہے کہ (امام کا) اقتدار قائم ہو جائے اور اقتدار اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک ان لوگوں کی اکثریت اس کا ساتھ نہ دے جو ہر زمانے میں معتبر سمجھے جاتے ہیں۔“^(۱۳)

بلکہ ایک جگہ تو امام غزالی اس سے بھی آگے جاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

”اگر کسی فرد واحد کو اتنی مقبولیت حاصل ہو اور اسے عوام کا اتنا اعتماد حاصل ہو کہ اس کی منظوری اور پسندیدگی عوام کی پسند اور منظوری سمجھی جائے تو صرف اس کا بیعت کر لینا ہی کافی ہے۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں۔“

فالشخص الواحد المتبوع المطاع.... اذا بايع كفى اذنى موافقته موافقة الجماهير^(۱۵)

یہاں یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ اہل حل و عقد کا انتخاب صرف اہل مدینہ میں سے کیوں کیا جاتا تھا مسائل و معاملات کے تعین میں آخر مدینے سے باہر پھیلی ہوئی پوری اسلامی دنیا کو فائدہ کی کیوں نہیں دکھاتی تھی۔ ہمارے قدیم مصنفین نے بھی اس سوال کا نوٹس لیا تھا۔ مثلاً قاضی ابو یوسف باقلانی (متوفی ۲۰۳ھ مطابق ۸۱۳ء) اور علامہ ابن حزم (متوفی ۴۵۶ھ مطابق ۱۰۶۳ء) نے بھی اس کا جواب دیا ہے۔ ان اصحاب کے نقطہ نظر کی ترجمانی ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

تمام اسلامی شہروں اور علاقوں کے اہل حل و عقد کا کسی ایک مقام پر جمع ہونا اور کسی ایک شخص کی بیعت پر اتفاق کر لینا ناممکن ہے اور اللہ تعالیٰ کسی جان پر اس کی طاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اہل حل و عقد دنیا کے ہر حصے میں پائے جاتے تھے تاہم ذرا لے نقل و حمل کی کمی کے باعث انہیں باقاعدگی سے دار الخلافہ میں نہیں بلایا جاسکتا تھا

مزید برآں کم از کم خلفائے راشدین کے دور میں اہل حل و عقد ہمیشہ صرف ایک شہر یعنی مدینہ میں موجود رہتے تھے۔ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تاعہ تھا کہ غزوہ بدر میں حصہ لینے والے اور بیعت رضوان میں موجود صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو مدینہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جانے اور وہاں مستقل طور پر سکونت پذیر ہونے کی عموماً اجازت نہیں دیتے تھے۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں اہل حل و عقد کے ادارے کی تعبیر و تشریح مختلف انداز میں کی جاتی رہی ہے۔ مختلف ملکوں اور مختلف اوقات میں اس کے ارکان بھی بدلتے رہے ہیں۔ اس تبدیلی اور اختلافات کی وجہ یہ رہی ہے کہ حالات میں تغیر پیدا ہوتا رہا۔ تقاضے اور ضرورتیں بدلتی رہیں اور مصلحت و وقت میں تبدیلی پیدا ہوتی رہی۔ لیکن بنیادی اصول ہمیشہ وہی رہے۔ دور خلافت راشدہ میں جیسا کہ ہم پہلے بیان بیان کر آئے ہیں غزوہ بدر اور بیعت رضوان میں حصہ لینے والے اور دیگر متنازع صحابہ مجلس اہل و عقد

کے رکن تھے۔ بعد کے زمانوں میں قبائل کے سردار و اہل علم و دانش فقہا بنائیاں عوامی شخصیتیں (اشرف واعیان) قاضی اور وزیر حسب ضرورت اہل حل و عقد میں شامل کئے جاتے رہے۔ جن شخص کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اسے عوام کا اعتماد حاصل ہے اس ادارے میں شامل کر لیا جاتا تھا بشرطیکہ وہ ضرورتاً قابلیت و مہارت کے وصف سے آراستہ ہو۔

چودھویں صدی ہجری کے آغاز میں مصر کے مفتی محمد عبده (متوفی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) نے تجویز پیش کی کہ اہل حل و عقد کو ایسے افراد پر مشتمل ہونا چاہیے جن کی طرف لوگ اپنی ضروریات کی تکمیل اور مسائل کے حل کے لئے رجوع کرتے ہوں۔ جیسے ٹریڈ یونینوں کے نمائندے صنعت کار مزدور و ہندوستانیوں اور کاشتکاروں کے رہنما، سیاسی جماعتوں کے لیڈر اور صحافی وغیرہ۔^(۱۲)

لیکن اس سلسلے میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اہل حل و عقد کی شرائط قابلیت کیا ہونی چاہیے۔ اس موضوع پر ہر دور کے مسلم فقہاء نے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور مختلف مفکرین نے مختلف شرائط قابلیت تجویز کی ہیں۔ لیکن جو شرائط قرآن و حدیث سے معلوم ہوتی ہیں اور جن پر تمام فقہاء اور مفکرین متفق ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اولوالاہر اہل حل و عقد (بشمول سربراہ مملکت) کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے عہدے کے پورے طرح اہل ہوں۔ جسمانی طور پر بھی اور ذہنی طور پر بھی تاکہ وہ اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دے سکیں۔ قرآن مجید عمومی انداز میں صرف اسی دو طرفہ شرائط اہلیت کا ذکر کرتا ہے اگر واضح زیادہ اور عملی انداز میں بات کرتی ہو تبھی اس اہلیت کی عملی تشریح مختلف زمانوں میں مختلف ہوگی۔ اب ظاہر ہے کہ آج سے پانچ سو سال قبل سالار عسکر کے لئے جو شرائط اہلیت موزوں قرار دی جاتی تھیں وہ آج موزوں نہیں ہوں گی۔ سربراہ مملکت کے لئے جن معلومات کا حاصل ہونا پانچ سو سال قبل ضروری سمجھا جاتا تھا آج وہ معلومات ناکافی بلکہ شاید نقصان دہ ہی ہوں۔ لہذا آج کے لئے مناسب ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کی تفصیلات آج کے

فقہاء ہی متعین کر سکتے ہیں۔ یہ بھی ضروری ہو گا کہ ان تفصیلات کے تعین میں آج کے عرف اور مصلحت کو پیش نظر رکھا جائے۔^(۱۰)

۲۔ انہیں عدل ہونا چاہیے یعنی اپنے عقیدے اور کردار میں راست رو اور سچے اور کم از کم با عمل مسلمان ہونا ضروری ہے عدل کی شرط پر تفصیلی بحث کے لئے مندرجہ ذیل مآخذ دیکھیے۔

(الف) ماوردی الاحکام السلطانیہ۔ ص ۶-۶۶

(ب) قاضی ابولیل القراء الاحکام السلطانیہ ص ۱۹-۲۰-۶۰-۶۱

(ج) قطان دودی۔ الشوری بن النظریۃ والتطبیق ص ۱۱۰-۱۱۳

(د) شاہ ولی اللہ ازالۃ الخواء۔ طبع لاہور

(ه) شاہ ولی اللہ۔ حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ باب خلافت

۳۔ کچھ علماء مسلمان ہونے کی شرط کو صفت عدل کی شرائط میں شامل سمجھتے ہیں اور کچھ اس کو ایک الگ شرط قرار دیتے ہیں۔ اہل حل و عقد کو بہر حال مسلمان ہونا چاہیے۔

ان کے علاوہ کچھ اور شرائط قابلیت بھی ہیں جنہیں عدالتی طور پر تو نافذ نہیں کیا جاسکتا لیکن ویسے غیر نظر رکھا جانا چاہیے۔ جیسا کہ نیکی تدبیر و حکمت وغیرہ

۳۔ شورعی اور قانون سازی کا دائرہ کار

آج ہم پارلیمنٹ کے قانون سازی اور غور و فکر سے متعلق فرائن کے لئے بنیادی اصول پر غور کی ضرورت قرار دے سکتے ہیں۔ شورعی کے فرائن اس لحاظ سے انتظامی بھی ہیں کہ وہ حکومت کے انتظامی اور دیگر امور کی نگرانی اور جانچ پڑتال کرتی ہے۔ اسلامی ریاست میں قانون سازی کی حدود اور اس سلسلے میں امت کو جو آزادی دی گئی ہے۔ اس پر کسی قدر تفصیلی بحث گزشتہ صفحات میں کی جا چکی ہے۔

میں ان عملے کے طور پر عرض ہے کہ مندرجہ ذیل پہلو ایسے ہیں جن میں ہم آج شورعی کو قانون سازی کے

اختیارات دے سکتے ہیں، لیکن پارلیمنٹ کی طرز پر تشکیل ہانے والی شوریٰ کو اختیارات دینے سے قبل خاصے سے بچاؤ کی ضرورت ہوگی، پارلیمنٹ کی تشکیل اس طرح کرنی چاہئے گی کہ اس میں شریعت کا علم اور اسلامی کردار رکھنے والوں کی ایک کثیر اور قابل ذکر تعداد موجود رہے۔

۱۔ اگر کسی نص کی ایک سے زیادہ تعبیریں ممکن ہوں تو شریعت کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے کسی ایک تعبیر کو اختیار کرنا۔

۲۔ اسلامی قوانین کے صحیح نفاذ کے لئے وسائل اور طریقے دریافت کرنا۔

۳۔ ایسے معاملات کے بارے میں قوانین بنانا جنہیں شریعت نے امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔

۴۔ مقاصد شریعت کی تکمیل کے لئے تمام ضروری اقدامات کرنا۔

قانون سازی کی آفادہ کے چار پہلو محض من مانتے ہیں مندرجہ بالا صفات کی روشنی میں درج ذیل بحث اس معاملے کو اور زیادہ واضح کر دے گی۔

قرآن مجید میں متعدد آیات ایسی ہیں جن سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ ارکان امت کے درمیان فہرین اور حکمرانوں کے درمیان اور الوالامر کے مختلف طبقات کے درمیان نزاع اور اختلاف رائے پیدا ہو سکتا ہے۔

آپس میں برسر نزاع فریقوں کے باہمی اختلافات اور جھگڑے ان اصولوں کی بنیاد پر طے ہونے چاہئیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مقرر کئے ہیں۔ اس سلسلے کی چند آیات اور ان کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَاطِيعُوا أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَالذَّالِكُ

خیر و احسن تاویلا۔^(۱۸)

”اے ایمان والو تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور تم میں جو لوگ اہل حکومت ہیں ان کی بھی پھر اگر کسی امر میں تم میں باہم اختلاف پیدا ہو جائے تو اس امر کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ پناہ دینے کی حاجت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ امر سب بہتر ہیں اور ان کا انجام خوشتر ہے۔“ یہ آیت واضح طور پر اختلاف رائے کی اجازت دیتی ہے حتیٰ کہ ایسے معاملات میں بھی جہاں کوئی نص موجود ہو چنانچہ اس نص کی صحیح تعبیر و تفسیر کے لئے اسے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹایا جاسکتا ہے۔

وما اختلفتم فیہ من شیء فحکمہ الی اللہ۔^(۱۹)

اور جہاں امر میں تم میں اختلاف پیدا ہو اس کا فیصلہ اللہ ہی کے سپرد ہے۔

ولو ردوہ الی الرسول والی اولى الامر منہم لعلمہ الذین یتنبطونہ منہم^(۲۰)

اور اگر یہ لوگ اس کو رسول اور ان لوگوں کے حوالے کرتے جو ان میں صاحب اختیار ہیں تو وہ لوگ اس

کو جان لینے جو ان میں تحقیق کرنے والے ہیں۔

قرآن مجید میں ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جو امت کے مابین جائز اختلاف رائے کو ایک امر واقعہ کے طور پر تسلیم کرتی ہیں۔ ان اختلافات کو حل کرنے کے لئے اسلام نے جو علاج تجویز کیا ہے وہ شوریٰ کا ادارہ ہے۔ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل دو آیات میں شوریٰ کا حوالہ دیا گیا ہے۔

وامرہم شوریٰ بینہم۔^(۲۱)

اور ان کا ہر کام آپس کے شورے سے ہوتا ہے۔

یہ آیت قرآن مجید میں اس مقام پر واقع ہوئی ہے جہاں مسلمانوں کی چند نمایاں خصوصیات بیان کی گئی ہیں اس سیاق و سباق میں نماز کا تذکرہ کرنے کے فوراً بعد تہیٰ کہ زکوٰۃ کے ذکر سے بھی پہلے شوریٰ کا ذکر کیا گیا ہے۔

دوسری آیت ہے۔

و شاورهم فی الامر (۲۲)

اور مسائل کے بارے میں ان سے مشورہ کرتے رہئے۔

مندرجہ بالا آیت قرآن مجید کے اس سیاق و سباق میں واقع ہوئی ہے جہاں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مسلمانوں سے

تعلقات کا ذکر ہے۔

بہت سی احادیث میں بھی خود ان کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی گئی ہے۔ ان میں سے چند میں نقل

کی جاتی ہیں۔

۱۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنگی مصالح کے بارے میں اپنے اصحاب سے مشورہ فرمایا کرتے تھے

کیونکہ بیشتر معاملات انہی سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن احکام شریعت سے متعلق وہ ان سے کوئی رائے نہ لیتے

کیونکہ ان کی تمام اقسام یعنی فرض، مندوب، مکروہ، مباح اور حرام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کر دیا۔^(۲۳)

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کو

اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے والا نہیں دیکھا۔^(۲۴)

۳۔ مشورہ دینے والے کی حیثیت امانت دار کی سی ہے۔ پس جب کسی سے مشورہ لیا جائے اسے

چلبیئے کو وہ وہی رائے دے جو اپنے لئے پسند کرے۔^(۲۵)

۴۔ اگر کسی سے اس کا جمالی مشورہ طلب کرے اور وہ بغیر سوچے سمجھے رائے دے تو وہ خیانت کا

مترکب ہوتا ہے۔^(۲۶)

۵۔ کوئی شخص مشورے سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔^(۲۷)

۶۔ جب تک تمہارے رہنما وہ لوگ ہوں جو تم میں بہترین ہوں تمہارے دولت مند خیر ہوں اور

تمہارے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہوں اس وقت تک زمین کی چھاتی تمہارے لئے اس کے

پیٹ سے بہتر ہے اور جب تمہارے رہنما ایسے لوگ بن جائیں جو تم میں سے سب اسے زیادہ برے

ہوں اور تمہارے امیر لوگ نخیل اور لالچی ہو جائیں اور تمہارے معاملات عورتوں کے ہاتھ میں پہنچ جائیں اس وقت زمین کا پیٹ تمہارے لئے اس کی چھاتی سے بہتر ہے۔^(۲۸)

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی ہر اہم معاملے میں شوریٰ کی طرف رجوع کیا۔ ایسے مواقع پر جو گنگو اور سوہج بچارہ ہوا مودعین اور محدثین نے اس کی تفصیلات کو محفوظ رکھا ہے۔ جن اہم معاملات پر مشورے کے لئے شوریٰ کے اجلاس ہوئے ان میں سے مندرجہ ذیل خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

- ۱۔ غزوہ بدر کے لئے میدان جنگ کا تعین
- ۲۔ غزوہ احد کے لئے میدان جنگ کا تعین
- ۳۔ امیران بدر کے بارے میں مناسب سلوک کا فیصلہ
- ۴۔ غزوہ خندق کے موقع پر مدینے کے دفاع کا مسئلہ
- ۵۔ غزوہ خندق میں مدینے پر چڑھائی کرنے والے بعض قبائل کے ساتھ التوائے جنگ کا معاہدہ
- ۶۔ واقعہ انک

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے صحابہ کرام نے بھی شوریٰ کا ادارہ باقی رکھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ائمہ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ مباح امور کے بارے میں باہل علم حضرات میں سے با اعتماد دوگوں کے ساتھ مشورہ کیا کرتے تھے۔ تاکہ ان میں آسان ترین چیز کو اختیار کر لیا جائے۔ لیکن اگر کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ سے مسئلے کی وضاحت ہو جاتی تو وہ قرآن و سنت سے تجاذد کے کسی اور چیز کو ہرگز نہ اختیار کرتے وہ سب حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے تھے۔

امام بیہقی اور دارمی نے روایت کی ہے کہ جب حضرت ابو بکر کے سامنے کوئی مسئلہ آتا تو وہ اس کا حل قرآن مجید میں تلاش کرتے۔ اگر وہاں نہ ملتا تو سنت میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے اگر وہاں بھی

وہ مسئلہ ملتا تو مسلمانوں کے سرکردہ اصحاب اور اہل علم لوگوں کو ملاتے اور ان سے مشورہ کرتے اور جب وہ لوگ کسی رائے پر متفق ہو جاتے تو معاطے کا تصفیہ اسی کے مطابق کر لیا جاتا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شوریٰ کا ادارہ زیادہ منظم بنیادوں پر قائم کیا۔ اس سلسلے میں ان کی خدمات بڑی نمایاں ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

”اس کام میں کوئی خیر نہیں جس کا فیصلہ شوریٰ کے بغیر کیا گیا ہو۔“^{۲۹}

حضرت عمرؓ نے صحیح طریقے کے مطابق شوریٰ سے استفادہ کے بغیر کبھی کسی معاطے کا فیصلہ نہیں کیا باقتلانی بیان کرتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے تمام فضل و کمال تفقہ فی الدین اخذ احکام اور قیاس کے طریقوں میں گہری بصیرت اور احادیث و آثار کا وسیع علم رکھنے کے باوجود اپنے اصحاب کے اجتماع ان کی موجودگی اور مشورے کے بغیر کبھی کوئی حکم نافذ نہ فرماتے تھے۔^(۳۰)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کے دور حکومت میں قانون سازی کے ذرائع کی انجام دہی میں شوریٰ برابر شریک رہتی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے جب کوئی مسئلہ پیش کیا جاتا تو وہ شوریٰ سے مشورے کے بعد اس کا فیصلہ فرماتے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ ایک ایک مہینہ تک اپنے ساتھیوں کے مشورے سے ایک مسئلہ پر غور فرماتے رہتے تھے۔^(۳۱)

روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عورتوں سے بھی مشورہ لیتے تھے۔^(۳۲)

مولانا شبلی نعمانی نے اپنی یادگار کتاب الفاروق میں حضرت عمرؓ کی شوریٰ کی تفصیل بیان کی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے متعدد ایوان (CHAMBERS) تھے۔ وہ تین علیحدہ علیحدہ ایوانوں پر مشتمل تھی جو مختلف قسم کے مسائل سے بحث کرتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے رائے تھی کہ شوریٰ امام کی ذمہ داریوں میں شریک ہوتی ہے اور اس امانت کا بوجھ اٹھانے میں اس کی مددگار ہوتی ہے جو امت کی جانب سے اس کے کاندھوں پر ڈالا جاتا ہے سو ادعائی کی زمینوں کے مسئلے کو طے کرنے کے لئے جو شوریٰ بلانی گئی اس کا افتتاح کرتے ہوئے آپ نے اپنے مشہور خطبے میں فرمایا۔

میں نے آپ کو صرف اس لئے ذمہ دہی ہے کہ آپ اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے میں میرے ساتھ شریک ہوں جو میرے کاندھوں پر ڈال دی گئی ہے اور جو آپ ہی کے امور و معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس معاملے میں میں بھی آپ کی طرح کا ایک فرد واحد ہوں اور نہیں چاہتا کہ آپ میری خواہش کی پیروی کریں۔ خلفائے راشدین کے دور میں شوریٰ نے جو مسائل طے کئے ان کی اہم ترین مثالیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ خلافت کا مسئلہ

۲۔ مرتدین کا مسئلہ

۳۔ مانعین زکوٰۃ کا مسئلہ

۴۔ وادی کی وراثت کا مسئلہ

۵۔ نشہ آور اشیاء کے استعمال کی سزا

۶۔ جنگوں سے تعلق رکھنے والے مسائل

۷۔ دیگر سرکاری پالیسیوں سے تعلق رکھنے والے مسائل

ان مواقع پر جو غور و فکر ہوا اور جو فیصلے کئے گئے ان کی تفصیلات مولانا حامد الانصاری غازی نے اپنی کتاب اسلام کا نظام حکومت میں بیان کی ہیں۔ ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شوریٰ کے اختیارات اور وظائف میں اتنی ہی قانون سازی اور غور و فکر یا خوروں سے متعلق تمام معاملات شامل ہیں۔

اب ہمیں مختصر طور پر یہ دیکھنا چاہیے کہ شوریٰ اور اس کے فرائض سے متعلق مسلم فقہاء اور مفکرین نے

کیا کہا ہے مسلم سپین کے مشہور فقہیہ اور تافہی ابن عیثہ (متوفی ۵۴۱ھ / ۱۱۴۶-۱۱۵۴ء) لکھتے ہیں۔

”شوری شریعت کی بنیاد اور اس کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اصول ہے جو (صاحب اقتدار) شخص اہل علم اور دیندار لوگوں سے مشورہ نہیں کرتا اسے معزول کر دینا واجب ہے۔ اس مسئلے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں (شوریٰ کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے) جب کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر ایمان والوں کی تعریف کی ہے کہ ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔“^(۳۲)

اسین ہی کے ایک اور نامور فقہیہ اور محدث تافہی ابو بکر ابن العربی (متوفی ۵۴۲ھ / ۱۱۴۸-۱۱۵۹ء)

شوریٰ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

”یہ ایک اجتماع ہے جس کا مقصد کسی مسئلے پر غور کرنا ہوتا ہے تاکہ سب لوگ ایک دوسرے سے مشورے کے بعد اپنا نقطہ نظر بیان کر سکیں۔“

قرآن مجید کے مسلمہ لغت نگار امام راغب اصفہانی (متوفی ۵۰۲ھ / ۱۱۰۸-۱۱۰۹ء) شوریٰ کی

تعریف یوں کرتے ہیں۔

”شوریٰ یہ ہے کہ رائے ایک دوسرے سے مشورے کے بعد قائم کی جائے۔“^(۳۳)

قرآن مجید کے ایک شیعہ مفسر شیخ ابو علی الطبرسی (متوفی ۵۴۸ھ / ۱۱۵۳ء) کی رائے ہے کہ شوریٰ کا مطلب ہے سوچ بچار اور تبادلہ خیالات تاکہ سچائی واضح ہو کر سامنے آئے۔“^(۳۴)

یہ بات حیرت انگیز ہے کہ شوریٰ کے ادارے کی اس انتہائی اہمیت کے باوجود بعض لوگ

دعوئی کر ڈالتے ہیں کہ امیر پر شوریٰ کے فیصلوں کی پابندی لازمی نہیں۔ یہ رائے اس قدر کمزور

ہے کہ اسے باوی النظر میں ہی روک دینا چاہیے۔ اس رائے کے حاملین دلیل کے طور پر عہد صلح کی دونظیروں کی غلط تعبیر کرتے ہیں۔ یہ دونظیریں مانعین نزکوٰۃ کے خلاف جہاد اور حبشہ اسامہ کی لڑائی

کے بارے میں ہیں۔

چونکہ ان دونوں نظیروں کا اس ضمن میں بہت ذکر کیا جاتا ہے۔ اس لئے ہم ذرا تفصیل سے اس کا جائزہ لیتے ہیں کیسی کیسی اس غلط رائے کی بنیاد لفظ "عزم" کی غلط تعبیر پر رکھی جاتی ہے جو سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۵۹ میں وارد ہے۔ آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ "اور ان سے مسائل میں مشورہ لیتے رہا کیجئے پھر جب آپ رائے پختہ کر لیں تو اللہ تعالیٰ پر اتما دیجئے۔"

اس مقام پر لفظ "عزم" سے بعض اصحاب کو یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ شوریٰ کی رائے محض ایک سفارش یا مشورہ کی حیثیت رکھتی ہے جس کی پابندی ضروری نہیں۔ لیکن مندرجہ ذیل حدیث سے بات بالکل واضح ہو جائے گی۔ ایک مرتبہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اس آیت میں لفظ "عزم" کے کیا معنی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مشاورۃ اهل الدرای ثم اتباعہم" اہل الدرای سے مشورہ لینا۔ پھر اس کی پابندی کرنا۔^(۳۷)

چوتھی صدی ہجری کے حنفی فقیہ اور مشہور مفسر قرآن علامہ ابو بکر جصاص نے بھی اس امر کا احساس کرتے ہوئے کہ بعض لوگوں کے ذہن میں آیت زیر بحث کے متعلق غلط فہمی پائی جاتی ہے اپنی تصنیف احکام القرآن (جلد ۲ صفحہ ۱۵۰) میں لکھا ہے۔

"عزم کا لفظ شوریٰ کے بعد لانا اس بات کی دلیل ہے کہ عزم کو شوریٰ سے صادر ہونا چاہیے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا۔

"اگر میں مشورے کے بغیر کسی کو اپنا جانشین نامزد کر سکتا تو ابن ام عبد کو نامزد کر دیتا۔"^(۳۸)

اس سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عبد اللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق اچھی رائے رکھنے کے باوجود انہیں نامزد نہیں فرمایا کیونکہ شوریٰ اس کی منظوری نہ دیتی۔

شوریٰ کے موضوع پر اس بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم ابن خوزیمہ منددا کا ایک قول نقل کرنا چاہتے

ہیں جو انہوں نے شوریٰ کے وجوب کو ثابت کرتے ہوئے بیان کیا ہے۔

”حکمرانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسے معاملات کے بارے میں جو انہیں معلوم نہ ہوں اور ایسے دینی امور کے بارے میں جو انہیں مبہم محسوس ہوں اہل علم سے مشورہ کریں اور ایسے معاملات کے سلسلے میں جو جنگ سے تعلق رکھتے ہوں مسلح افواج کی نمایاں شخصیات سے مشورہ کریں اور عوامی مفاد و دلچسپی سے متعلق امور کے بارے میں عوام کے رہنماؤں سے مشورہ کریں اور ملک کی ترقی و تعمیر سے تعلق رکھنے والے مسائل کے بارے میں اعلیٰ افسروں (سکریٹریز وغیرہ) اور وزراء سے مشورہ کریں۔“

بعض اوقات کچھ لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ مسلمان شوریٰ کو ایک باقاعدہ ادارے کی شکل میں منظم نہ کر سکے اور دور خلافت راشدہ کے بعد شوریٰ ختم ہو گئی لیکن تاریخی شہادت اس دعوئی کے خلاف ہے حقیقت یہ ہے کہ خلفائے راشدین کے بعد اس عمل کو وہ تاریخی اہمیت حاصل نہیں رہی جو ان کے دور میں حاصل تھی دوسرے یہ کہ بعد کے دور کے نظائر کو ماخذ قانون کی حیثیت سے بھی زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ قانون اور علم فقہ پر لکھی جانے والی کتابوں میں اس دور کی شوریٰ کی تفصیلات یا نظائر کا ذکر نہیں ملتا۔ تاہم کتب تاریخ میں بعض ضروری تفصیلات موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن نے اپنی کتاب تاریخ الاسلام السیاسی میں مرابطین موجدین اور سپہین کے اموی حکمرانوں کے اختیار کردہ نظام شوریٰ کے بارے میں مفید اور دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔

(جاری)

حوالہ جات

۱- شرح المقاصد بحوالہ قطان عبدالرحمن الدوری۔ الشوریٰ بین النظریہ والتطبیق مطبوعہ بغداد

- ۲- حجۃ اللہ البالغہ مطبوعہ قاہرہ - ۱۳۲۲ھ جلد دوم صفحہ ۱۱۱
- ۳- عرف کے موضوع پر تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے مندرجہ ذیل مآخذ
- ڈاکٹر مصطفیٰ احمد زرقا، الفقہ الاسلامی فی توبہ المہدیہ جلد اول طبع دمشق ۱۹۶۳ء ص ۱۴۲-۱۵۰
- محمد اسلام المدخل للفقہ الاسلامی مطبوعہ قاہرہ ۱۹۶۰ء ص ۲۴۳-۲۴۴
- محمد تقی امینی فقہ اسلامی کا تاریخ پس منظر مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء ص ۲۶۱-۲۸۰
- ساجد الرحمن صدیقی، عرف و عادات اور تعامل، اسلامی قانون میں مطبوعہ ماہنامہ فکر و نظر
- ۴- ان اصولوں پر تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے۔
- شرح مجملہ الاحکام العدلیہ (باب اول) تالیف خالد الاتاسی یا ابن رستم باز
- الاشباہ والنظائر از سیوطی
- الاشباہ والنظائر از ابن نجیم
- ۵- مصلحت کے موضوع پر مزید تفصیل کے لئے دیکھئے کتب مذکورہ بالا :
- ڈاکٹر زرقا۔ صفحات ۶۷-۱۴۲
- تقی امینی۔ صفحات ۲۲۷-۲۴۳
- مذکورہ صفحات ۲۵۸-۲۶۱
- ۶- بدائع الصنائع کتاب القضاء جلد ۷ ص ۱۶
- ۷- کتاب التہیذ از باقلانی ص ۱۸۴
- ۸- تفتازانی - شرح المقاصد - جلد ۲ صفحہ ۲۷۲
- ۹- الایچی المواقف بحوالہ شرح المواقف جلد ۸ صفحہ ۳۵۵
- ۱۰- دیکھئے مفتی محمد شفیع کی تصنیف جواہر الفقہ جلد دوم صفحات ۲۹۵-۳۰۱ مطبوعہ کراچی

- ۱۰- بحوالہ مولانا امین احسن اسلامی اسلامی ریاست ص ۱۲۰
- ۱۱- دیکھیے قرارداد مقاصد جو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کی تمہید ہے
- ۱۲- اس نکتے پر تفصیل بحث کے لئے مندرجہ ذیل ماخذ کا مطالعہ کیجیے۔
- (۵) فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر تالیف مولانا محمد تقی امینی صفحات ۲۸۰-۲۸۴
- (ب) حجۃ اللہ البالغہ تالیف حضرت شاہ ولی اللہ محدثی بکرت باب ۲۱
- ۱۳- دیکھیے شریعتی کی کتاب معنی المتاح جلد ۴ صفحہ ۱۳۰ اور نہایت المحتاج مصنفہ ربلی جلد ۴ صفحہ ۳۹۰
- ۱۴- فضائح الباطنیہ ص ۱۷۷
- ۱۵- ایضاً
- ۱۶- دیکھیے تفسیر المنار جلد ۵ صفحات ۱۸۱-۱۸۷
- ۱۷- عمومی حوالے کے لئے دیکھیے قرآن مجید سورۃ النساء ۵۸ سورۃ البقرہ ۲۲۷ سورۃ یوسف ۵۵
- سورۃ القصص ۲۶
- ۱۸- القرآن ۳- ۵۹
- ۱۹- القرآن ۲۲- ۱۰
- ۲۰- القرآن ۳- ۸۳
- ۲۱- القرآن ۲۲- ۳۸
- ۲۲- القرآن ۳- ۱۵۹
- ۲۳- القرطبی۔ الجامع الاحکام القرآن۔ جلد ۱۶-
- ۲۴- ترمذی۔ بیہقی۔

- ۲۵ - مجمع الزوائد - جلد ۸ - صفحہ ۹۶
- ۲۶ - بہیقی
- ۲۷ - بہیقی
- ۲۸ - ترمذی
- ۲۹ - بحوالہ محمد انصاری - محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ جلد سوم صفحہ ۱۷
- ۳۰ - التہذیب مصنفہ باقلانی ص ۲۰۰
- ۳۱ - المبسوط الامام انصاری جلد ۱۶ ص ۸۳
- ۳۲ - بہیقی جلد ۱۰ صفحہ ۱۱۳ ابن حزمی - سیرت عمر صفحہ ۱۳۲
- ۳۳ - کتاب الخراج
- ۳۴ - قرطبی الجامع الاحکام القرآن - جلد صفحہ ۲۳۶ -
- ۳۵ - بحوالہ روح المعانی جلد ۲۵ ، ص ۴۲
- ۳۶ - تفسیر مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۳۳
- ۳۷ - تفسیر ابن کثیر جلد ۱ صفحہ ۴۲۰
- ۳۸ - ترمذی - مستدرک حاکم
- ۳۹ - قرطبی - الجامع الاحکام القرآن ج ۴ ص ۲۴۹ - ۲۵۰